سہ ماہی

الزبیر

بہاول پور

اُردو اکیڈمی بہاول پور

ISSN 1811-8403

سہ ماہی

الزبیر

۲۰۱۸ء
شمارہ نمبر ۱

ہائر ایجوکیشن کمیشن پاکستان سے منظورہ شدہ

سرپرست
کیپٹن (ر) ثاقب ظفر
صدر اُردو اکیڈمی و
کمشنر بہاول پور ڈویژن

مدیر
ڈاکٹر شاہد حسن رضوی

اُردو اکیڈمی بہاول پور

مجلس مشاورت

سہ ماہی الزبیر

جلد نمبر ۵۹ — شمارہ نمبر ۱
کمپوزنگ: ڈاکٹر محمد صفدر جاوید — ناشر: اُردو اکیڈمی بہاول پور
مطبع: گردیزی پرنٹنگ پریس بہاول پور — قیمت: ۳۰۰/-
ملنے کا پتہ: ۳۳سی ماڈل ٹاؤن ''اے'' بہاول پور — فون: 062-2731934
Cell # : 0300-9684150 — E-Mail: editor.alzubair@gmail.com

مندرجات

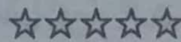
مقالات/تحقیق/تنقید

مضامین/بحث ونظر

شعر و سخن

افسانہ/انشائیہ/ناولٹ/خاکہ

خصوصی مطالعہ/نقد و نظر



محمد احمد ترازی☆

ڈاکٹر مظہر حسین☆☆

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف بہاری اُمتِ مسلمہ اور دوقومی نظریہ

Abstract:

The second decade of the 20th century AD was a turbulent period in the Muslim History of the subcontinent Indo-Pak. At the peak of the World War I, the Khilafat Movement along with its off-shoots i.e. Migration Movement (Tehreek e Hijrat) and Tehreek e Tark e Mawalat (Non-cooperation Movement) proved fatal to the fabric of Muslim society and politics by creating a lot of confusion and chaos. Muslim politics was sidelined while the passion overshadowed the vision. In such situation the religio-political leaders filled this vacuum. Syed Suleman Ashraf Bihari, from the Barelavi was one of them. He throughout his entire life worked continuously and selflessly for the promotion of Two-Nation Theory. His prime time was post-Khilafat milieu when he came on the forefront in order to prepare Muslims to face the non-conduciveness of the international political dynamics. He, through his pen and passion warned Muslims to apprehend the international scenario and advised them not to move blind-faith. The research paper in hand highlights his religio-political services for the Muslim Cause in the subcontinent.

کلیدی الفاظ (Keywords): سلیمان اشرف، امت مسلمہ، دوقومی نظریہ، ہندو تمدن، اسلامی قومیت، رنگ و نسل، ذات پات، اکبری الحاد، امتیازی تشخص

دوقومی نظریہ کا آغاز وارتقاء

۸، مارچ ۱۹۴۴ء کو قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "پاکستان اُسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا...... مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا، وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔"(۱)

قائد اعظم کا یہ قول جہاں برعظیم میں ملت اسلامیہ کی مبداء و اساس کی جانب بلیغ اشارہ کرتا ہے۔ وہاں اسلام کی آمد اور ترویج و اشاعت کے ساتھ نسلی، لسانی اور مذہبی اختلافات میں منقسم اس خطے میں دوقومی نظریے کا آغاز وارتقاء کی جانب بھی واضح اشارہ کرتا ہے۔ انسان جیسے ہی اللہ کی حاکمیت اور رسالت محمدی کا اقرار کرتا ہے، وہ نسل

☆ کراچی ☆☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ تاریخ، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور

انسانی کی تمام نسلی، جغرافیائی، ثقافتی اور لسانی عصبیتوں سے علیحدہ ہو کر ایک نئی قوم ''مسلمان'' بن جاتا ہے۔

اسلام ایسا دین ہے جو ہمیشہ ایک ملت کی تخلیق میں کوشاں رہتا ہے۔ یہ رنگ و نسل اور لسانی و جغرافیائی اختلافات کو مٹا کر ایک نئی وحدت ''مسلم اُمت'' تشکیل دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام کی آمد نے برعظیم میں عدل و مساوات پر مبنی ایک نئے مسلم معاشرے کا منظر نامہ پیش کیا۔ اسلام کی ہمہ گیریت اور جامعیت نے خطے کے مذہبی، تہذیبی اور معاشرتی تصورات پر گہرے اثرات ڈالے اور مقامی باشندوں کو اپنے حسنِ سلوک سے نہ صرف متاثر کیا بلکہ انہیں زندگی گزارنے کے بہترین اُصولوں سے بھی آشنا کیا۔ اسلامی تعلیمات نے محمد بن قاسم (۷۱۲ء/۹۳ھ) سے لے کر تیمور اور آل تیمور (۱۸۵۷ء) تک ہندوستانی سماج پر نہ صرف تمدن کی سطح پر گہرے اثرات مرتب کیے، بلکہ ذات پات کے نظام کو بھی کاری ضرب لگائی۔ اسلام چونکہ ذات پات، رنگ و نسل اور زبان و علاقے کی تفریق و امتیاز نہیں کرتا اس لیے مردم گزیدہ مخلوق اس کے دامن میں پناہ لینے لگی۔ برعظیم میں اسلام کی آمد سے قدامت پسندی رخصت ہونے لگی اور ایک جدید ہندوستان کی نوعیت ابھرنا شروع ہوئی۔ جس میں مقامی باشندوں کی بود و باش سے لے کر اقدار تک متاثر ہوئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا باہمی میل جول کسی حد تک ایک اکائی میں ڈھل گیا۔ یہ اکائی ''ہندوستان'' قرار پائی۔ گو مسلم آئیڈیالوجی یا اسلامی نظریہ حیات کی وسعت نے بھائی چارے کی فضا پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مگر مسلمانوں نے اپنی خصوصیت اور انفرادیت برقرار رکھی اور مقامی آبادی میں ضم ہونے سے ہمیشہ گریز کیا۔ جہاں بھی مسلمانوں کی آبادی تھیں وہاں اُن کا رجحان اپنی ملت کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی طرف تھا۔ انہوں نے اپنی ایک مستقل ہستی بنائی اور جداگانہ ثقافت اور معین اغراض و مقاصد کی تشکیل کی۔ (۲)

شہنشاہ ہمایوں تک مسلم حکمرانوں نے اسی جذبہ مروّت اور رواداری کا مظاہرہ کیا۔ مگر مسلم اقتدار کو ہندو سرداروں کے ایک طبقے نے قبول نہیں کیا اور نہ ہی وہ یہ فراموش کر پائے کہ مسلمانوں نے انہیں سیاسی اقتدار سے محروم کیا ہے۔ چنانچہ انہیں جب بھی موقع ملتا وہ مسلم حکمرانوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے رہے۔ ابتداء میں مسلم حکمرانوں نے اِن بغاوتوں کا سختی سے خاتمہ کیا۔ لیکن جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں انہیں اہم معاملات میں مسلمانوں کے برابر دربار میں مناصب دیئے گئے۔ جس نے برعظیم پاک و ہند میں مسلم اقتدار کی دیواروں کو متزلزل کر دیا۔ اکبر کی پالیسیوں نے اسلام مخالف عناصر کو دین میں انحراف کا موقع دیا۔ اس کے ساتھ ہی بھگتی تحریک (۳) کو تقویت حاصل ہوئی۔ جس میں ہندوستان میں موجود دو بڑے مذاہب کے درمیان امتیاز ختم کرنے کی کوشش کی گئی اور اسلام اور ہندومت کو ایک درخت کی دو شاخوں سے تشبیہ دی گئی، جن کی جڑ ایک ہے۔ اس صورتحال سے ہندوؤں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ تحریکِ خلافت، تحریکِ ہجرت اور ترکِ موالات کے ہیجانی دور میں جب بڑے بڑے مسلمان زعماء اس کی رُو میں بہہ گئے اور ڈاکٹر اقبالؒ و قائداعظمؒ جیسے رہنماؤں نے اس طوفان بلاخیز کے آگے ہتھیار ڈال کر خاموشی اختیار کر لی۔ اُس وقت محدث بریلوی نے سخت مزاحمت کی اور وحدتِ ملی کے چراغ روشن کیے۔ آپ نے علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی طرح حالات کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور نہ ہی خاموشی اختیار کی بلکہ ''جن لوگوں نے میدان میں آ کر خلافت، ہجرت اور ترک موالات جیسی نقصان دہ تحریکوں کی (بانگ دہل) مخالفت کی اور اُن کے حامیوں اور لیڈروں کا زور توڑا، وہ حضرت احمد رضا خاںؒ اور اُن کے اتباع، رفقاء اور عقیدت مند ہی

تھے۔"(۴) محدث بریلویؒ نے آزادی و حریت کیلئے جو راہ متعین کی تھی آپ کے بعد آپ کے صاحبزادگان، خلفاء، تلامذہ، متوسلین اور محبین نے اسی راہ پر چلتے ہوئے آپ کے افکار و نظریات کو آگے بڑھایا اور اس تحریک کو جاری رکھا۔ ان میں ایک نمایاں نام پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف بہاری(۵) کا بھی ہے۔

مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

پروفیسر سید سلیمان اشرف صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا شمار ان علمائے کرام میں سے ہیں جن کی ذات علم و عمل کی جامع تھی۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ان افراد میں سے تھے [illegible] حلقۂ احباب میں وہ مختلف الخیال علماء و اہل علم شامل تھے جو ان کی صحبت اور محفل میں حاضری کو اپنے لیے باعث فخر و سعادت سمجھتے تھے۔ آپ معقولات کے عالم، الٰہیات کے ماہر [illegible] اور ادیب تھے اور اپنے استاد مولانا ہدایت اللہ خان جونپوری سے بے انتہا محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ مولانا ہدایت اللہ کے بعد جس ہستی کی عظیم شخصیت سے پروفیسر سلیمان اشرف متاثر ہوئے وہ محدث بریلوی مولانا احمد رضا خان کی ذات گرامی تھی۔ یہ محدث بریلوی کا فیضان نظر تھا کہ پروفیسر سید سلیمان اشرف نے زندگی بھر جدوجہد کی [illegible] انہوں نے قومی زندگی کے ہر اہم موڑ پر [illegible] بصیرت سے کام لیتے ہوئے ملت اسلامیہ کی فکری رہنمائی کی اور کبھی باطل افکار و نظریات سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ان کی زندگی "مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ" کی مصداق تھی۔

سید سلیمان اشرف، اُمت مسلمہ اور وحدت ملی کا نظریہ:

بیسویں صدی کا ابتدائی عشرہ مسلمانان عالم اور بالخصوص مسلمانان ہند کیلئے [illegible] کا عشرہ ہے۔ ایک طرف عالم اسلام پر مصائب و آلام کے بادل چھائے ہوئے تھے تو دوسری جانب مسلمانان برصغیر بہت سے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی مسائل سے دوچار تھے۔ ترکی کی خلافت عثمانیہ اور دیار حرمین میں مقامات مقدسہ کی حفاظت جیسے اہم ترین مسائل نے انہیں سخت اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ کسی مسلمان کے دکھ درد اور تکلیف کو اپنا دکھ درد اور تکلیف محسوس کرنے والے پروفیسر سید سلیمان اشرف بے حس رہتے۔ ان کا دل خون کے آنسو روتا اور تحریر و تقریر میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے۔ چنانچہ آپ ۱۹۱۲ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب "[illegible]" میں مسلمانوں کو احساس ذمہ داری یاد دلاتے ہوئے جھنجوڑتے ہیں، [illegible] سے نکلنے اور کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کے حصول کا راستہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں: "آہ! [illegible] زمانے میں [illegible] خلافت کا [illegible] حاصل ہے۔ اس کا تمام [illegible] ہو رہا ہے۔ کیا اس وقت بھی تم اسی خواب خرگوش میں پڑے سوتے رہو گے۔ کیا اب بھی اپنی حالت نہ سنبھالو گے۔ مسلمانو! خدا کا کلام تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ رسول اللہ کا عملی نمونہ تمہارے پیش نظر ہے۔ [illegible] اس کو پڑھو اور اپنی حالت سنبھالو۔ صدق دل سے توبہ کرو اور اس کی رحمت کو اپنے اعمال حسنہ سے اپنی جانب متوجہ کرو۔ اگر تم میں تقویٰ و خشیت [illegible] تو آج پھر تمہاری وہی عزت [illegible] جو کبھی تمہاری ہوا کرتی تھی۔"(۶)

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

پروفیسر سید سلیمان اشرف یورپی ممالک کے مسلمانانِ عالم پر ڈھائے جانے والے مظالم اور اسلام دشمنی کا بنیادی سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس وقت تمام بلادِ اسلامیہ پر جو ستم و جفا کے بادل ٹوٹ پڑے ہیں وہ صرف اس علت میں کہ مسلمان لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کیوں کہتے ہیں۔" (۷) وہ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کو سخت ناپسند کرتے تھے اور استعمار کے ہاتھوں کھلونا بننے کو انتہائی معیوب سمجھتے تھے۔ اُن کے خیال میں مسلمانوں کی طاقت کو جب ضعف واضمحلال نے آلیا تو استعمار کو دراندازی کا موقع ملا۔ چنانچہ وہ انہیں باہمی رنجشوں اور کدورتوں کو مٹانے اور بنیان مرصوص "اُمتِ واحدہ" بننے کا مشورہ دیتے ہیں اور مسلم قومیت کی شناخت وعلامت "دو قومی نظریہ" کا تصور واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "ہم مسلمانوں کی قومیت مذہب اور صرف مذہب سے ہے۔ ہماری قومیت کی بقاء اسلام وایمان سے قائم ودائم ہے۔ جس قدر قوتِ ایمانی وجذباتِ اسلامی میں ہم مضبوط ہونگے اُسی قدر ہماری قومیت ٹھوس ومستحکم ہوگی اور جتنا اس میں اضمحلال پیدا ہوگا اتنا ہی ہماری قومیت سُست وناتواں رہے گی...... چونکہ ہماری قومیت صرف اسلام وایمان ہی سے مراد ہے۔ ایک ہندی کو ایک عرب کا، ایک امریکن کو ایک افریقی کا، ایک حبشی کو ایک شامی کا، ایک چینی کو ایک قریشی کا، ایک نومسلم کو ایک سید صحیح النسب کا، صرف کلمہ طیبہ پڑھ لینا ہم قوم بنادیتا ہے۔ ایک کافر صد سالہ نے جس وقت اس مقدس کلمہ کی تلاوت کی، فوراً مسلمانوں کی قومیت میں داخل ہوگیا اور اُن تمام ہمدردیوں کا بالاستحقاق دعوے کے ساتھ مستحق ہوجاتا ہے جس ہمدردی کا سبق شارع علیہ السلام نے قولاً وفعلاً مسلمانوں کو پڑھایا ہے۔" (۸)

پروفیسر سید سلیمان اشرف کی زندگی کا ایک قیمتی اور روشن پہلو ملتِ اسلامیہ کیلئے دردمند دل رکھنے والے غم خوار کا بھی ہے۔ اُن کا سینہ اُمتِ مسلمہ کی زبوں حالی سے آزردہ تھا اور آنکھیں زوالِ اُمت پر اشکبار تھیں۔ وہ دین اور سیاست کی تفریق کے سخت مخالف تھے۔ "البلاغ" کے عنوان "اسلام وخلافت" کے ص ۳۔۲ پر خود فرماتے ہیں "جو مذہب اپنی حفاظت نہیں کرسکتا اور اپنی مامون زندگی کیلئے طاقت روا نہیں رکھ سکتا ہے اُس کا وجود محالاتِ عادلہ میں سے ہے اور وہ ایک فلسفۂ خیالی سے زائد مرتبہ نہیں رکھتا۔ وہ ہاتھ جس میں اخلاقِ حسنہ کی کتاب ہو نہایت ہی مقدس وواجب التعظیم ہے۔ اُس ہاتھ کو بوسہ دیجئے، آنکھوں پر رکھیئے۔ لیکن سلامت وہی ہاتھ رہ سکتا ہے جس میں خونچکاں شمشیر کا قبضہ دکھائی دے۔"

دل بیدار پیدا کر کہ دلِ خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب کاری نہ میری ضرب ہے کاری

یہ درست ہے کہ کسی قوم کے اجزائے ترکیبی میں اگر تہذیبی، ثقافتی، سماجی، مذہبی اور روحانی عوامل تو موجود ہوں، مگر سیاسی شعور غائب ہو، تو ایسی متذکرہ تمام خصوصیات کا حامل انسانی گروہ، سیاسی شعور سے عاری ہونے کی وجہ سے "ایک قوم" کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں ہوسکتا۔ سید محمد سلیمان اشرف برعظیم کے مسلمانوں میں سیاسی شعور کی افادیت واہمیت اور ضرورت سے واقف تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنی کتاب "البلاغ" کے حصہ "اسلام اور خلافت" میں "اسلام و تمدن...... اسلام وسیاست...... اسلام وحرب...... اور...... خلافت......" جیسے عنوانات قائم کرکے مسلمانوں میں سیاسی شعور کی بیداری کی بھرپور کوشش کی۔ تاکہ مسلمان اپنے قومی وملی حقوق کا تحفظ اور اپنی آزادی وخودمختاری کا دفاع کرسکیں۔ ساتھ ہی آپ نے یہ بھی واضح کیا کہ اسلام صرف تزکیہ نفس کی ہی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ سیاست سمیت جملہ شعبہ زندگی کیلئے مکمل رہبری ورہنمائی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ (۹)

برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کی آمد نے جہاں نظام سیاست کے ساتھ ساتھ کم و بیش زندگی کا ہر شعبہ تہہ وبالا کر دیا تھا۔ وہاں تعلیم کے شعبہ کا متاثر ہونا ایک لازمی بات تھی۔ انگریز چاہتے تھے کہ یہاں کے لوگوں کو تعلیمی لحاظ سے پسماندہ رکھا جائے۔(۱۰) تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کو اپنی رائے بدلنی پڑی اور حکومتی سرپرستی میں کئی تعلیمی ادارے وجود میں آئے۔ جن کا پس پردہ مقصد عیسائیت کی فروغ و اشاعت کے ساتھ "تعلیم برائے ملازمت" (۱۱) تھا۔ اور ایک ایسا طبقہ وجود میں لانا تھا جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو لیکن ذوق، ذہن، اخلاق اور فہم و فراست کے اعتبار سے انگریز ہو۔ چنانچہ اس انداز تعلیم کا سب سے بڑا نقصان بیان کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ "اس تعلیم کے بندے اپنی روایات و تہذیب اور اپنے اخلاق اور تاریخ سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ چیزیں جو قومیت کی بنیاد ہیں، ان کی نظروں میں حقیر معلوم ہونے لگتی ہیں، وہ مغربی تہذیب و رسوم کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں...... جو (ہمارے) قومی نظام کے لیے نہایت خطرناک ہے۔"(۱۲)

چنانچہ ان عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے ۲۷، دسمبر ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ کالج کے قیام کے گیارہ سال بعد آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ جسے بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نام دیا گیا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد علی گڑھ کے علاوہ دیگر علاقوں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پر غور و خوض اور اُن میں مغربی تعلیم کا شوق پیدا کرنا، نیز مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کر کے اُن میں سیاسی شعور کی بیداری بھی تھا۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۱۴ء میں کانفرنس کا اٹھائیسواں سالانہ اجلاس راولپنڈی میں منعقد ہوا۔ جس کے ساتویں سیشن منعقدہ ۲۹، دسمبر ۱۹۱۴ء سے پروفیسر سید سلیمان اشرف نے بھی خطاب کیا۔ اپنے خصوصی خطاب میں اُنہوں نے جدید تعلیم و زبان کی اہمیت و افادیت اور ضرورت کو واضح کرتے ہوئے اسے مومن کی گمشدہ میراث قرار دیا اور فرمایا کہ یہ تمہاری اپنی چیز ہے جہاں تمہیں ملے اُسے اٹھالو۔ پروفیسر سلیمان اشرف کہتے ہیں "پس اے عزیزو! کیا تمدن کی روح اس کے سوا اور چیز ہے؟ کیا سائنس الٰہی اس اَمر کو منکشف نہیں کرتا کہ کس چیز کو ہم کس طرح اپنے کام میں لائیں؟ اگر یہی بات ہے اور ضرور یہی بات ہے تو میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں کہ تمدن و سائنس کی سنگ بنیاد قرآن کریم کی یہی تعلیمات ہیں۔ سائنس پڑھنا، اس میں کمال پیدا کرنا، حقیقت میں مسخرہ مخلوق سے مستفید ہونا ہے اور اُن کے مسخر ہونے کو بامعنی بنایا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ قرآن ہمیں جن اُمور کی طرف رہنمائی کرے، جن سے بہرہ مند ہونے کی ترغیب دلائے، ہم اُسے مذہب کے خلاف سمجھیں۔ تو پھر کھانا پینا، پہننا، رہنا سب ہی دشوار ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ کون سی زبان میں ان علوم کو پڑھیں؟ اس تنگ وقت میں زیادہ بحث کا موقع تو نہیں، لیکن اس قدر سمجھ لیجیے کہ اردو، فارسی، پنجابی، پشتو، بنگلہ وغیرہ تو جائز ہوں، مگر یورپ کی زبان حرام، آخر اس کی وجہ؟ اگر آج تمام یورپ یا کوئی اُس کا حصہ دائرہ اسلام میں آ جائے تو کیا اُسے اپنی مادری زبان کا بولنا یا اُس میں پڑھنا حرام ہو جائے گا؟ کیوں خدا کی رحمت کو اس قدر تنگ کیا جائے؟ اور ترجیح بلا مرجح دی جاوے؟ الحکمۃ ضالۃ المؤمن حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ اپنی چیز جہاں تمہیں مل جائے اُسے فوراً اٹھالو:

سخن کز بہر حق گوئی چہ عبرانی چہ سُریانی
مکان کز بہر او جوئی چہ جا بلقا چہ جا بلسا(۱۳)

آپ نے اس تقریر میں مسلم معاشرے میں در آنے والی خرابیوں کا بھی ذکر کیا اور اہل علم کے اپنا لے سے ان کے تدارک کی سعی انجام دی۔ آپ مسلمانوں کو متحرک کرنے کیلئے دعوت فکر و عمل دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں "جس طرح کل کا کھانا آج کی بھوک کو رفع نہیں کرتا، اسی طرح گزشتہ اقبال کا تذکرہ آج ہمیں اقبال مند نہیں بنا دے گا...... ہائے وائے کرنے سے وہ عظمت اسلامی واپس نہیں آتی...... قرآن کریم کا فتویٰ ہے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔" (۱۴) یعنی

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اسی تقریر میں پروفیسر سید سلیمان اشرف نام نہاد مذہبی و سیاسی لیڈروں کی جانب امت کی فلاح و بہبود کیلئے ان کے تجویز کردہ حل کو رد کرتے ہوئے اسلامی فلسفہ کامیابی و کامرانی یوں بیان کرتے ہیں۔ آج "اصلاح قوم کیلئے کوئی تجارت کی رغبت دلاتا ہے۔ کوئی علوم مغربی کے سحر آفریں فضائل سناتا ہے۔ کوئی علوم مشرقی کی ہدایت کرتا ہے۔ کوئی صنعت و حرفت کی طرف مائل کرتا ہے۔ لیکن خدا تو یہ فرماتا ہے کہ تم میرے مطیع ہو جاؤ پھر سب چیزیں تمہاری تابع فرمان ہو جائیں گی۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ (۱۵)

(یعنی تم بھی خدا کے حکم سے سرکشی نہ کرو تا کہ کوئی بھی تمہارے حکم سے سرتابی نہ کرے۔) تم اللہ کے ہو جاؤ تمام چیزیں تمہاری ہو جائیں گی۔ تم اللہ سے پھر جاؤ گے تمام نعمتیں تم سے منہ موڑ لیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر پُر خطر اور کٹھن مرحلے میں ہمیں مولانا سید محمد سلیمان اشرف کا ہی آہنگ سنائی دیتا ہے، جو ان کی غیر معمولی دینی غیرت و حمیت اور مومنانہ حق گوئی و بے باکی پر شاہد و عادل ہے۔

برعظیم کی سیاسی تاریخ میں "متحدہ قومیت (ایک قومی نظریہ) کا تصور سیدھا سادا تصور نہ تھا۔ اس کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ یہ دراصل دو فلسفوں کا کھلا تصادم تھا۔ شرار بولہبی چراغ مصطفوی سے آمادۂ پیکار تھا۔ ایک طرف فلسفہ گاندھی تھا، جو کہتا تھا کہ "رہنا ہے تو ہمارے بن کر رہو" جبکہ دوسری جانب فلسفہ محمدی اتھا۔" (۱۶) جس نے مسلمانوں کو رنگ و نسل اور زبان و علاقہ کے تمام باطل امتیازات کو مٹا کر غلامی مصطفیٰ کی لڑی میں پرو دیا ہے" تمہارے کیسے ایک ہو سکتے تھے!" چنانچہ اس نازک وقت میں جبکہ قوم کا سیاسی شعور پختہ نہیں تھا بعض حضرات متحدہ قومیت (ایک قومی نظریہ) کے علمبردار علماء کے کردار کو حسن اسلام بنا کر پیش کر رہے تھے۔ شاید وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ غیر شعوری طور پر نئی نسل کے دل میں ان کی محبت قائم کر کے بالواسطہ طور پر متحدہ قومیت (ایک قومی نظریہ) کے تصور کو پھیلا رہے ہیں۔ یہ طرز عمل نہایت ہی خطرناک تھا۔

پروفیسر سید سلیمان اشرف برعظیم پاک و ہند میں اس خطرناک رجحان کو مسلم قومیت کی بقاء کیلئے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ متحدہ قومیت (ایک قومی نظریہ) کی آبیاری دراصل اسلامی تعلیمات سے دوری ہی نہیں، بلکہ اپنے جداگانہ تشخص کی نفی اور دو قومی نظریہ کی اصل حقیقت سے انحراف بھی ہے۔ چنانچہ آپ نے اس زمانے

میں اس خطرناک رجحان کے خلاف نعرۂ حق بلند کرتے ہوئے دو معرکۃ الآراء کتابیں ''الرشاد'' اور ''النور'' تصنیف کیں۔ ''الرشاد'' ۱۹۲۰ء۔ ۱۹۲۱ء کے ہیجانی دور کی ایک یادگار تاریخی علمی کاوش ہے۔ جو مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج سے طبع ہوئی۔ اور ہزاروں کی تعداد میں اس کتاب کے نسخے آپ نے اپنی جیب خاص سے مسلمانانِ ہند میں استفادے و رہنمائی کیلئے تقسیم فرمائے۔ بنیادی طور پر اس کتاب میں آپ نے مسلمانوں کے امتیازی مذہبی شعار ''گائے کی قربانی'' کو موضوع گفتگو بنایا اور مسئلہ قربانی گاؤ اور انسداد گاؤ کشی کے جملہ عنوانات پر سیر حاصل بحث کی۔

آپ کے نزدیک شعائر اسلامی پر عمل پیرا ہونا دین کی حمایت اور بقاء ہی نہیں تھا، بلکہ آپ کے نزدیک شعائر اسلامی کا تحفظ مسلم قومیت کی جداگانہ حیثیت اور امتیازی تشخص کی علامت بھی تھا۔ چنانچہ آپ ہندو مسلم اتحاد کو ایک مریض کیلئے ڈاکٹر کے بجائے وکیل کا تجویز کردہ ایسا نسخہ قرار دیتے ہیں جو مریض کے مرض میں کمی کے بجائے مزید اضافے کا سبب بنتا ہے۔ آپ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان موالات اور معاملات کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں ہنود اور مسلم دونوں برابر کے شریک ہیں۔ ایسے سارے معاملات میں جن کا ہند کی صلاح وفلاح سے تعلق ہو اس میں دونوں کا متفق اللسان و ہم زبان ہونا چاہیے۔ مدافعت آفات میں دونوں قوموں کے بازو بلا امتیاز قومیت ہمدردانہ مساویانہ معاضدت سے ساعی ہوں۔ لیکن خصوصیات مذہبی میں ایک کا دوسرے سے بالکل علیحدہ اور بے تعلق رہنا ہی اولیٰ ہے۔ شادی غمی، صحت و مرض، تعزیت و عیادت اور از یں قبیل دیگر ضروریات زندگی میں ایک دوسرے کے مونس و غمگسار، ہمدرد و بہی خواہ رہیں، مگر مذہبی امور میں ہنود مسلم کے مشیر اور شریک نہ ہوں، نہ ہنود کے مذہب میں مسلمان دخل دیں۔ اگر اس میں بھی اتحاد کی کوشش ہوئی تو وہی نتیجہ سامنے آئے گا جو وکیل کی نسخہ نویسی سے مریض کو اٹھانا پڑا۔''(۱۷)

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

آپ اس اتحاد سے مسلمانوں کو پہنچنے والے مضمرات اور ہندوؤں کو پہنچنے والے ثمرات کا ذکر کرتے ہیں اور مسلمانوں کی قیمتی جانوں کے ضیاع اور مسلمان لیڈروں کے شرمناک طرز عمل پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو ہندوؤں کا نہ صرف معاشرتی اور تمدنی فائدہ ہے بلکہ مذہبی حیثیت سے ایسی اہم خدمت دینی اور سعادت مذہبی کا ہندوؤں کو ملنا ہے، جس کا عوض اور بدل کچھ اور متصور بھی نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کا جان و مال سے عملاً اہل ہنود کا شریک ہو جانا اور ان کے پہلو بہ پہلو موت کا پیالہ پینا کیا تشکر و امتنان کا مستحق نہیں..... ایک مسلم کی جان جو قیمت رکھتی ہے، اس کا اندازہ صرف اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود ان کے پیدا کرنے والے نے جب ان کی جانوں کو طلب کیا تو اس کا معاوضہ جنت سے کم اس مالک الملک احکم الحاکمین کی جناب سے بھی نہ قرار پایا..... ایسی قیمتی جانیں جب ستیہ گرہ کے موقعہ پر قربان کی جا چکی ہیں تو کیا ان کا صحیح عوض صرف زبانی ہمدردی ہے۔ صد افسوس مسلمانوں کی بدبختی اور کسمپرسی کہ ان کی جانوں کی تو قدر نہ کی جائے اور چند ہندوؤں کی زبانی ہمدردی پر مسلمان شعار توحید اور شعار اسلام قربان کر دیں۔''(۱۸) ساتھ ہی پروفیسر سید سلیمان اشرف متحدہ قومیت کے حامیوں کو متنبہ کرتے ہیں اور اپنے قومی تشخص کی بقاء پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''اتحاد کی کوشش قومیت کا نیست و نابود کرنا ہے۔ اشتراک و امتیاز کی سرحدوں کو نمایاں رکھنا، اپنی قومی ہستی کو قائم و باقی رکھنا ہے۔''(۱۹)

"اسلام کا درد ہوتا، مسلمانوں کی محبت ہوتی، زوال خلافت کا صدمہ ہوتا تو قوت پیدا کرنے کے صحیح ذرائع اختیار کرتے ۔اُسوہ حسنہ جسے حق سبحانہ نے فرمایا ہے، اُس کی پیروی نہایت سرگرمی سے کرتے۔"(۲۵) آپ مسلمانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے فرماتے ہیں "مسٹر گاندھی اور اُن کے ہنود پارٹی کا جام ولا کب تک پیچھے رہو گے۔"(۲۶) "دوستو اب بھی آنکھیں کھولو، دیکھو تمہاری اس موجودہ حالت سے ہندوؤں نے کیسا فائدہ اٹھایا۔"(۲۷) پھر آپ مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی مسائل کا حل تجویز کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔"زندگی کا ہر شعبہ اور حیات انسانی کا ہر لمحہ جو اس عالم امکان میں وقوع پذیر ہو سکتا ہے، اُن سب کے طریق عمل کا صحیح نمونہ پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات میں موجود ہے۔اُمت کی سعادت اس میں ہے کہ اپنے واقعات زندگی میں اُسی حیات طیبہ کی تقلید و اتباع کریں۔(۲۸) آپ دعا گو ہوتے ہوئے کہتے ہیں "مولیٰ تعالیٰ خاتم النبیین ﷺ کی اُمت کو ہدایت عطا فرمائے کہ وہ اپنے پیغمبر کی اتباع کا شرف حاصل کرے اور غلامی کفار سے نجات پائے۔"(۲۹)

پروفیسر سید سلیمان اشرف کے نزدیک مسلمان قوم کی ترقی و استحکام اور سیاسی اثر و نفوذ کیلئے اعلیٰ تعلیم کا حصول بہت ضروری ہے۔چنانچہ آپ مسلمانوں میں تعلیمی شعور کی زبوں حالی اور پسماندگی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے صرف تین کالج ہیں، علی گڑھ، لاہور اور پشاور۔اس وقت ہندوستان میں مجموعی تعداد کالجوں کی ایک سو پچیس (۱۲۵) ہے۔تین (۳) مسلمانوں کے ایک سو بائیس (۱۲۲) ہندوؤں کے ۔۔۔۔ ہندو طلبہ کی تعداد اکتالیس ہزار پانچ سو باسٹھ (۴۱۵۶۲) ہے۔کہا جاتا ہے ہندو چوبیس (۲۴) کروڑ اور مسلمان سات (۷) کروڑ ہیں......جس قوم کی تعلیمی حالت یہ ہو کہ سات کروڑ میں صرف چار ہزار (۴۰۰۰) مشغول تعلیم ہوں، اُس قوم کا یہ ادعا اور ہنگامہ کہ اب ہمیں تعلیم کی حاجت نہیں، اگر خبط وسودا نہیں تو اور کیا ہے۔"(۳۰) آپ تعلیم کی ضرورت و اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں "قوم کا علمی شغف جس پر دارومدار فضیلت انسانی ہے۔قوم کے مراسم و دستور جس پر اقتصاد و تمدن کی بنیاد ہے اور سب سے بڑھ کر قوم کی دماغی زندگی جس سے حوصلہ میں وسعت، خیالات میں بلندی ضمیر میں روشنی پیدا ہوتی ہے، ان سب کا سرچشمہ اہل علم کا گروہ ہوتا ہے۔"(۳۱)

آپ عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے مروجہ جدید تعلیم کے حصول کو ضروری خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ایسی تعلیم گاہیں جن کی سند و تصدیق مصدقہ و مسلمہ ہوں اور ایسے اسانید جن سے ملازمت کا استحقاق ہو اس وقت تک ضروری ہیں جب تک حکومت باقی ہے۔"(۳۲) پروفیسر سید سلیمان اشرف حقیقی معیار تعلیم کو قوم کی ترقی کا نصب العین قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔"یہ موقع ایک لمحہ تغافل کا بھی متحمل نہیں، ضرورت ہے کہ جلد سے جلد تر باہمی مشورے سے تعلیم گاہوں کا ایک صحیح نصب العین قرار دیا جائے...... مسلمانان ہند کو یہ موقع ضائع نہ کرنا چاہیے، اگر اس وقت بھی انہوں نے اپنے تعلیم گاہوں کا صحیح نصب العین قرار نہ دیا تو پھر آئندہ کیلئے ذلت وخواری سے رستگاری کی کوئی سبیل نہیں...... نیاز مندانہ التماس ہے کہ (تعلیم اور) تعلیم گاہوں کی طرف سے غفلت نہ کیجئے۔"(۳۳)

سید محمد سلیمان اشرف صاحب ایک قادر الکلام مقرر، دور بیں محقق، صاحب طرز ادیب، عظیم مدبر اور بہترین معلم کے ساتھ ایک ماہر تعلیم بھی تھے۔جب ۱۹۲۶ء۔۱۹۲۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں میٹرک سے لے کر ایم اے تک شعبہ دینیات کیلئے نصاب مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو نصاب مرتب کرنے والی کمیٹی میں دیگر

ماہرین تعلیم کے ساتھ آپ بھی شامل تھے۔ تحریک ترکِ موالات کے دوران جمعیت علمائے ہند اور بعض لیڈروں مولانا محمد علی جوہر، شوکت علی، مولانا محمود الحسن اور گاندھی وغیرہ نے تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامیہ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور میں تعلیمی سرگرمیاں معطل اور کالج کو بند کرانا چاہا۔ اس وقت سید محمد سلیمان اشرف نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو متحدہ قومیت اور ترکِ موالات کے سیلاب سے بچانے کیلئے مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نصاب تعلیمات اسلامیہ کیلئے تجاویز بھی مرتب کیں۔ یہ تجاویز اور تعلیمی منصوبہ ۱۹۲۴ء میں ''السبیل'' کے نام سے مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے شائع ہوئی۔

ایک صاحب بصیرت اور دیاض وقت رہنماء کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ماضی حال اور مستقبل پر نگاہ رکھتا ہے اور وہ ماضی کی روشنی میں حال کو بہتر بنانے اور مستقبل میں پیش آنے والے خطرات سے قوم کو آگاہ ہی نہیں کرتا، لائحہ عمل بھی فراہم کرتا ہے۔ سید محمد سلیمان اشرف کی نگاہ دوربین دیکھ رہی تھی کہ انگریز بہت جلد اقتدار کی شاہ کلید ہندوؤں کو سونپ کر جانے والا ہے۔ آپ محسوس کر رہے کہ مسلمان ایک کی غلامی سے نکل کر دوسرے کی غلامی میں جانے والے ہیں۔ چنانچہ آپ قوم اور لیڈران قوم کو درپیش خطرے سے آگاہ کرتے ہیں کہ ''وہ ساعت دور نہیں جب کہ انگریز ہندوؤں کو اُن کا منہ مانگا سوراج دے کر خود اپنے ملک و وطن کو چلے جائیں، اُس وقت ہندوؤں کی اطاعت و فرمانبرداری اضطراری و بے اختیاری ہوگی، جس کی آستانہ سوراج پر نہ کوئی قیمت ہوگی نہ کسی طرح کی قدر دانی۔''(۳۴) اس لیے بہتر یہی ہے کہ خواب غفلت سے نکلو...... کہ...... ''ضعف کو قوت سمجھنے میں مسلمانوں کی تباہی ہے۔ غفلت کو تیاری سمجھنا دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہونا ہے۔''(۳۵)...... اٹھو اور جاگو...... کہ...... ''حکومت انگریز کی ہو یا ہندوؤں کی اسلام و اہل اسلام کیلئے اس میں کوئی فلاح نہیں ہے''(۳۶)...... آپ ایک قومی نظریے کی محبت سے سرشار نیشنلسٹ رہنماؤں کو احساس دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''ایک دشمن سے نجات پانے کی تدبیر میں رستگاری سے قبل دوسرے دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جانا نہ عقل کا فتویٰ ہے نہ تعمیل شریعت الٰہی ہے۔''(۳۷)...... اس خام خیالی سے باہر نکلو کہ ہندو تمہارے ہمدرد و معاون ہیں...... لہٰذا ''مومنوں کے سوا کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔''(۳۸) ...... اور اپنے اتحاد و یکجہتی اور جداگانہ تشخص ''مسلم قومیت'' کو اختیار کرتے ہوئے اپنے تحفظ و بقاء کی فکر کرو کہ......

''تیری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں۔''

''النور'' کے مندرجہ بالا اقتباسات کا ایک ایک لفظ وحدت ملی، شعار اسلامی کے تحفظ و دفاع، مسلمانان ہند کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی استحکام، اُن کی تعلیمی پسماندگی و بحالی کی تجاویز و آراء اور دو قومی نظریہ کے تحفظ و احیاء کا گواہ ہے۔ معروف اسکالر کیپٹن خالد درانی پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف کی کتاب ''النور'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

Tow Nation Theory and Tehreek e Khilafat have been the focus of this Book. The learned Professor has had deep insight and has driven home to the reader what miseries the points under debate have brought to the fate of millions of Indian Muslims.(39)

ترجمہ ''یہ کتاب دو قومی نظریہ اور تحریک خلافت کے گرد گھومتی ہے۔ اس موضوع پر فاضل پروفیسر کی نظر

گیری ہے۔ وہ کروڑوں مسلمانوں کی خستہ حالی کا سبب بننے والے امور کی نشاندہی قاری پر بڑے موثر پیرائے میں کرتے ہیں۔ حقیقت یہ کہ آپ کی اس تالیف نے اسلامیانِ برصغیر پاک و ہند کی آنکھیں کھول دیں۔" یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو دو قومی نظریے پر ایک مستند تاریخی دستاویز سمجھا جاتا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان کے اس پرآشوب دور میں جب کہ "متحدہ ہندوستان" اور "ہندو مسلم متحدہ قومیت" کے نعرے بلند ہو رہے تھے، کے خلاف پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف نے "جماعت رضائے مصطفےٰ" کے پلیٹ فارم سے بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ ۲۳ مارچ ۱۹۲۱ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی زیرِ صدارت بریلی میں ہونے والے جلسہ عام میں اپنے بیباکانہ موقف کا اظہار فرمایا اور ان کو مشرکین ہند کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط و اتحاد کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے اسلامی نظریہ قومیت "مسلم قومیت" کا بھرپور دفاع کرکے لاجواب کر دیا۔ (۳۰) سید محمد سلیمان اشرف نے نہ صرف تحریراً بلکہ تقریراً بھی مسلمانانِ ہند کی دینی و سیاسی رہنمائی کا فریضہ بطریق احسن سرانجام دیا اور مذکورہ طوفانی و ہیجانی دور میں اس انجام سے بچانے کی سعی کی، جس سے گاندھی کی گہری سیاست انہیں دوچار کرنا چاہتی تھی۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے   عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء کا دور تحریکِ خلافت، ترکِ موالات، ہجرت، ترکِ گاؤکشی اور شدھی و سنگٹھن جیسے طوفانوں کا زمانہ تھا۔ یہی وہ دور تھا، جس میں ملتِ اسلامیہ اور ہندوؤں کے درمیان "مسلم قومیت" اور "متحدہ قومیت" کی نظریاتی جنگ لڑی گئی۔ محدث بریلوی، سید محمد سلیمان اشرف اور دیگر اکابر علمائے اہلسنت نے اس جنگ میں اپنا وزن "دو قومی نظریے" کے پلڑے میں ڈالے رکھا اور کمال بصیرت سے کام لیتے ہوئے اس اسلامی تشخص و شناخت کا بھرپور تحفظ و دفاع کیا۔ اس نظریاتی جنگ اور ان حضرات قدسیہ کی مساعی جمیلہ کی داستان ممتاز قانون داں خالد لطیف گابا اپنی کتاب "مجبور آوازیں" میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "دو قومی نظریہ جس پر بڑے بحث و مباحثے ہوتے رہے ہیں، آل انڈیا مسلم لیگ یا آل انڈیا مسلم کانفرنس یا دیوبند (۳۱) یا جامعہ ملیہ کی تخلیق نہیں تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس نظریے کے مصنف نہ تو محمد علی جناح تھے اور نہ علامہ اقبال۔ دو قومی نظریہ تو ۱۹۲۰ء میں ایک مشہور اور مسلمہ نظریہ بن چکا تھا۔ اس وقت جناح صاحب کانگریس کے رہنما اور بقول سروجنی نائیڈو "ہندو مسلم اتحاد" کے سفیر تھے۔" (۳۲) جناب خالد لطیف گابا کا یہ اقتباس واضح طور پر اس حقیقت کو منکشف کر رہا ہے کہ دو قومی نظریے کے اصل محرک اور محافظ کون لوگ ہیں۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ سید محمد سلیمان اشرف ان علمائے حق میں سے تھے، جن کی جدوجہد نے برصغیر میں جذبہ اسلامی اور تشخص ملی کو برقرار رکھا۔ یہ ان کا اور دیگر اکابرین اہلسنت و جماعت کا عزم صمیم تھا جو بعد میں پاکستان کی تمہید ثابت ہوا۔ جب ہم تحریکِ خلافت، ترکِ موالات اور ترکِ گاؤکشی وغیرہ میں پروفیسر سید سلیمان اشرف کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں تو حضرت اقبالؒ کے ان اشعار کا مفہوم واضح ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

وہی ہے تیرے زمانے کا امامِ برحق   جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے   فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

اگر آج آپ پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف کی تصنیفات کی روشنی میں اس دور کی ان تحریکات کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو آپ پروفیسر سید سلیمان اشرف کو ان روشن ضمیر ممتاز علماء کی صف میں پائیں گے، جنہیں اللہ نے دینی و

سیاسی بصیرت و بصارت سے نوازا تھا اور جن کا دل ملت بیضا کی فکری بیداری اور اُن کے روشن مستقبل کیلئے آشنائے درد تھا۔ بلاشبہ پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف بہاری کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے۔ مگر اُن کی حیات مستعار کے کئی اہم گوشے اُس تب و تاب کے ساتھ منظر عام پر نہیں آسکے، جس کے وہ مستحق تھے۔ زیر نظر تحریر سے ملت اسلامیہ کے اس فراموش کردہ عظیم، مگر مظلوم مفکر کی زندگی کے ایک پہلو کا کچھ جزوی حصہ ضرور سامنے آتا ہے، لیکن اُن کی زندگی بہت سے گوشے ابھی بھی ایسے ہیں جن پر مزید تحقیق وجستجو کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ کیا یہ پرلے درجہ کی بے حسی اور احسان ناشناسی نہیں کہ پون صدی کا عرصہ گزرنے کے باوجود اُن کی حیات و کارناموں پر کوئی خاطر خواہ یا مبسوط کام نہ ہوسکا۔ لہٰذا ضرورت اس اَمر کی ہے کہ ہماری جامعات میں اُن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی کام کی طرف توجہ دے کر اُن کی حیات وخدمات سے نئی نسل کو روشناس کرایا جائے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) قائد اعظم محمد علی جناح کا ۸، مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا سے خطاب، محمد متین خالد، اسلام کا سفیر، علم و عرفان پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۲۳

(۲) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص:۱۲۶

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے مطابق "جذبہ انفرادیت اور اس کے بقاء کی خواہش ہی دراصل ہماری قومیت کی بنیادیں ہیں۔ اس برعظیم کے مسلمان چودہ سو سال سے ساتھ رہنے، ایک ضابطہ حیات کا پابند ہونے، عروج و زوال، ترقی و انحطاط میں شراکت کی وجہ سے ایک قوم بن گئے اور تمام ذیلی اختلافات کے باوجود اُن میں صدیوں میں جذبہ قومیت پرورش پاکر مستحکم ہوگیا۔ اگر یہ جذبہ قومیت استوار نہ ہوتا تو برعظیم کے مسلمان کبھی کے ہندوؤں میں مدغم ہوگئے ہوتے۔" (نظریہ پاکستان کے تاریخی، سیاسی اور معاشرتی پہلو۔ نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور ۱۹۹۹ء، ص:۱۲)

(۳) بھگتی تحریک کی ابتداء بارہویں صدی عیسوی میں جنوبی ہند میں ہوئی۔ یہ تحریک تصوف کی ہندوستانی شکل تھی۔ اُس کے بانی سوامی رامانج (۱۰۱۶ء۔ ۱۱۳۷ء) مادھو (۱۱۹۹ء۔ ۱۲۷۸ء)، آنند تیرتھ، وشنو سوامی اور باسو تھے۔ جنوبی ہند کے بعد شمالی ہند میں اس کی ترویج کرنے والے رامانند تھے۔ (سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء۔ کراچی مکتبہ دانیال، ۲۰۰۲ء، ص:۱۵۸) اکبر کے عہد حکومت میں بھگتی تحریک نے اپنے اثرات پھیلائے۔ گو "مغلیہ سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی ان قوتوں کی بالادستی نے اپنا اظہار شروع کر دیا تھا، تاہم اس کا شدید ترین اظہار مغل اعظم ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر کے عہد حکومت میں ہوا۔" (قاضی جاوید، برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء، نگارشات لاہور، ۱۹۸۶ء، ص:۸۰)

(۴) میاں عبدالرشید، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۱۱۶، ۱۱۷

(۵) سید محمد سلیمان اشرف بہاری ۱۸۷۸ء صوبہ بہار کے ایک مردم خیز دیہات محلہ میرداد، ضلع نالندہ کے ممتاز سید گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولانا حکیم سید عبداللہ تھا، جو اپنے زمانے کے فاضل طبیب وعالم تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے اعمال محترم "مولانا عبدالقادر، مولانا عبدالرزاق، مولانا عبدالغنی اور مولانا عبیداللہ" سے حاصل کی۔ اس کے بعد بہار اسکول میں داخلہ لیا، لیکن دسویں جماعت میں طبیعت دینی تعلیم کی جانب مائل ہوگئی۔ چنانچہ اسکول کو خیرآباد کہا اور مولانا

نور محمد اصدقی سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ سید محمد سلیمان اشرف نے "مدرسہ اسلامیہ" استھانواں میں مولانا سید محمد احسن استھانوی سے بھی اخذ علم کیا۔ مدرسہ اسلامیہ کے بعد آپ نے اپنی تعلیمی زندگی کا کچھ عرصہ مولانا احمد حسن کانپوری کی درسگاہ "دارالعلوم ندوہ" میں بسر کیا۔ بعد از علوم اسلامیہ کی منتہی کتب کی تکمیل علامہ فضل حق خیر آبادی کے شاگرد امام المعقولات حضرت مولانا ہدایت اللہ خان جونپوری سے کی۔ آپ کے اساتذہ میں ایک قابل ذکر نام مولانا یار محمد بندیالوی کا بھی ہے۔ سید محمد سلیمان اشرف حضرت مولانا قاری نور محمد چشتی نظامی فخری سے بیعت وارادت کے ساتھ سلسلہ اشرفیہ کے عظیم بزرگ حضرت سید علی حسین اشرفی میاں جیلانی سے طالب اور خلافت یافتہ تھے۔ آپ کو محدث بریلوی حضرت مولانا احمد رضا سے بھی خلافت واجازت حاصل تھی۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن شیروانی کی کوشش سے ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات میں پروفیسر کی حیثیت سے آپ کی تقرری ہوئی۔ بعد ازاں صدر شعبہ دینیات کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن، سابق وائس چانسلر علی گڑھ، سر محمد علی محمود خان، راجہ محمود آباد، نواب مزمل اللہ خان، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، جسٹس سر شاہ محمد سلیمان، سر راس مسعود، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد زبیری، نواب محمد اسماعیل خان وغیرہ کا شمار آپ کے معاصرین میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمن انصاری، بانی المرکز الاسلامی، کراچی، داماد و خلیفہ مبلغ اسلام علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی، پروفیسر محمد محمود احمد، سابق صدر شعبہ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ڈاکٹر ذاکر حسین، سابق صدر بھارت، سید امیر الدین قدوائی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، سابق صدر شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ڈاکٹر سید عابد احمد علی، پنجاب پبلک لائبریری، لاہور، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، لاہور، مولانا ابرار حسین گوپاموی وغیرہم کا شمار آپ کے مشہور تلامذہ میں ہوتا ہے۔ آپ کی مایہ ناز تصانیف میں المبین، النور، الرشاد، الانہار، امیر خسرو کی مثنوی "ہشت بہشت" پر محققانہ و فاضلانہ مقدمہ، السبیل، الحج، ازاحۃ الغفال فی لحیۃ الرجال، البلاغ اور انقلاب شامل ہیں۔ ۲۵ اپریل ۱۹۳۹ء کو آپ کا انتقال ہوا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شیروانیوں کے قبرستان میں آپ کی تدفین ہوئی۔

(۶) سید محمد سلیمان اشرف، البلاغ، ص: ۲۵، طبع مطبع احمدی علی گڑھ، اشاعت الاول ۱۹۱۱ء، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ادارہ پاکستان شناسی، سوامی دیال کالونی، لاہور

(۷) سید محمد سلیمان اشرف، اسلام اور خلافت، ص: ۲۳، مشمولہ البلاغ، طبع مطبع احمدی علی گڑھ، اشاعت الاول ۱۹۱۱ء، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ادارہ پاکستان شناسی، سوامی دیال کالونی، لاہور

(۸) سید محمد سلیمان اشرف، البلاغ، ص: ۲۰، طبع مطبع احمدی علی گڑھ، اشاعت الاول ۱۹۱۱ء، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ادارہ پاکستان شناسی، سوامی دیال کالونی، لاہور

(۹) "احکام شرعیہ سے جو حضرات ناواقف ہیں ..... وہ بطائے جہل مرکب یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام صرف نماز کی تعلیم سکھاتا ہے باقی اسے دنیاوی امور میں کوئی دخل نہیں ..... لہٰذا یہ بتلا دینا (ضروری ہے) کہ اسلام ہی ہے جس نے تمدن وسیاست وحرب تمام دنیا کو سکھلایا۔ (سید محمد سلیمان اشرف، البلاغ، ص: ۹، طبع مطبع احمدی علی گڑھ، اشاعت الاول ۱۹۱۱ء، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ادارہ پاکستان شناسی، سوامی دیال کالونی، لاہور)

(۱۰) طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، حماد الکتبی، شیش محل روڈ لاہور (س ن) ص: ۱۶۳-۱۶۴

(۱۱) بقول پروفیسر سید محمد سلیم "لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کو اگر تعلیم برائے ملازمت کا عنوان دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔" بحوالہ، مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ" ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، ۱۹۸۹ء، ص:۱۱۹

(۱۲) مولوی عبدالحق، خطبات عبدالحق، مگلڈ، انجمن کتاب گھر وکٹوریہ روڈ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص:۲۰۴

(۱۳) سید محمد سلیمان اشرف، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، ص:۲۳۔۲۲

(۱۴) سید محمد سلیمان اشرف، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، ص ۱۹

(۱۵) ایضاً　ص:۲۴

(۱۶) ڈاکٹر مسعود احمد، تحریک آزادی ہند اور السواد اعظم، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص:۲۲۔۲۱

(۱۷) سید محمد سلیمان اشرف، الرشاد، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء، ص:۱۰

(۱۸) ایضاً　ص ۱۴　(۱۹) ایضاً　ص ۸

(۲۰) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، ص:۱۷۱

(۲۱) ایضاً　ص:۱۷۴۔۱۷۳

(۲۲) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، ص:۴۶

(۲۳) ایضاً　ص:۲۲۷

(۲۴) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، ص:۷

(۲۵) ایضاً　ص:۱۴۳　(۲۶) ایضاً　ص:۱۶۰　(۲۷) ایضاً　ص:۳۸

(۲۸) ایضاً　ص:۵۷۔۵۶　(۲۹) ایضاً　ص:۱۰۷　(۳۰) ایضاً　ص:۱۹۷

(۳۱) ایضاً　ص:۱۴۵　(۳۲) ایضاً　ص:۱۸۵　(۳۳) ایضاً　ص:۲۰۳۔۲۰۶

(۳۴) ایضاً　ص:۲۰۷　(۳۵) ایضاً　ص:۲۱۵　(۳۶) ایضاً　ص:۲۰۷

(۳۷) ایضاً　ص:۲۰۹　(۳۸) ایضاً　ص:۲۱۵

(۳۹) دیباچہ، السبیل، سید محمد سلیمان اشرف، طبع جدید، ۲۰۱۴ء، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ص:۴۵

(۴۰) تفصیل کیلئے دیکھئے کتاب "ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست" از۔ محمد جلال الدین قادری، مکتبہ رضویہ لاہور ۱۹۸۰ء

(۴۱) دیوبند اور علمائے دیوبند کی دو قومی نظریہ کی مخالفت ہماری قومی تاریخ کا ایک شرمناک باب ہے۔ جس کا مقصد ہندوؤں کی خوشنودی اور رضا کا حصول تھا۔ اور اس کے مقابلے میں ایک قومی نظریہ "متحدہ قومیت" کے گمراہ کن فکر و فلسفہ کو عام کر کے سوراج یعنی ہندو راج کا نفاذ تھا۔ ان حضرات نے دیدہ و نادیدہ گاندھی کے سحر میں مبتلا ہو کر اسی کامل آزادی جس مقصد ہندو اقتدار تھا، دو قومی نظریہ کی بھرپور مخالفت کی۔

(۴۲) خالد لطیف گابا، مجبور آوازیں، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۵ء، ص:۱۰



ISSN 1811-5403

AZ-ZUBAIR

URDU ACADEMY
BAHAWALPUR